قومی یکجہتی اور اردو ادب

ہندوستان ایک بہت وسیع وعریض ملک ہے۔ یہاں کئی مذاہب، زبانیں اور کلچر ہیں۔ اس تہذیبی کثرت کا سب سے بڑا وصف اس کی رنگارنگی ہے۔ لوگ اس پر بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ مگر جب حالات نے پلٹا کھایا تو یہی چیز جی کا جنجال بن گئی۔ آج قومی سالمیت کا مسئلہ شش جہت بن گیا ہے۔ ایک طرف ذات پات کی لعنت ہے، دوسری طرف علاقائیت کا زور ہے، تیسری طرف مرکز اور ریاستوں میں رسہ کشی ہے، چوتھی طرف سرمایہ داروں اور ناداروں میں طبقہ وارانہ ذہنیت کا فروغ ہے پانچویں طرف مختلف جماعتوں اور پارٹیوں کے درمیان چپقلش ہے، چھٹی طرف ہندو مسلم، ہندو سکھ اور دیگر فرقوں کے باہمی تعلقات کی کشیدگی ہے۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ پر نہایت اہم اور قابل توجہ مسائل ہیں لیکن قومی آہنگی کے نام کے ساتھ جو بات سب سے پہلے ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے وہ ہے فرقہ وارانہ ہم آہنگی، اس لئے یہاں اس موضوع پر ہم اظہار خیال کریں گے۔

جہاں تک قومی عصبیت کا سوال ہے بلاشبہ یہ تمام فرقوں میں کم وبیش موجود ہے۔ مختلف ذاتیں، لسانی گروہ بندیاں اور مذہبی فرقے ہیں۔ ذات پات کا نظام خود سماجی تفریق کی بنا پر قائم ہوا تھا اور اب تو نئے سٹ اپ میں ہر بالغ کو رائے دہندہ بنا دینے کے باعث اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ زبانوں کا اختلاف شروع سے تھا مگر الگ الگ ریاستوں کی زبانیں علاقائیت کے جذبات پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ مذہبی فرقہ پروری موجودہ قومی انتشار میں سب سے اہم ہے۔ مذہبی احیا پرستی کی کوششوں نے تہذیبی اور سماجی بالادستی کی طرف رخ کو موڑا تو دوریاں اور بڑھ گئیں۔

ایک قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مذہب کا مقام مسلم ہے۔ دور قدیم ہی سے مذہب ہماری مشرقی دنیا کا ایک ورثہ مانا گیا ہے آج تک اس کی ضرورت پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ چوں کہ ہندوستان کی سماجی زندگی ایک عرصہ دراز سے مذہبی اساس پر استوار رہی، اسی لئے اس میں نشوونما پانے والی تمام تہذیبیں جیسے ویدک، بدھ متی، پورانک وغیرہ مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، اسی خصوصیت کی بنا پر اس ملک کو دنیا کی مرکزی عبادت گاہ کہا جانے لگا تھا۔

اس حقیقت کی روشنی میں اگر ہماری قدیم تہذیب کا سراپا جائزہ لیا جائے تو جو بات سب سے پہلے محسوس ہوگی وہ یہ کہ یہاں کے سماجی اختلافات کی کثرت میں مذہبی وحدت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ یقیناً سو فی صد لوگ ہندومت کے پیرو تھے، مگر عقیدوں کی عدم یکسانیت عام تھی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس مذہب کا بانی کوئی ایک شخص نہ تھا بلکہ ابتداء ہی سے لوگوں کو اختیار تھا کہ اپنی اپنی پسند کا دیوتا مقرر کرلیں۔ تہذیب وتمدن میں ہم آہنگی نہ ہونے کا سبب یہ بھی تھا کہ ان کے تصورات الگ الگ تھے۔ مثلاً ذات پات پر ایمان رکھنے والا بھی ہندو، اونچ نیچ کا مارا ہوا بھی ہندو، گوشت خور بھی ہندو، اور اس سخت پرہیز کرنے والا بھی ہندو، وہ بھی ہندو تھا جو بہت سے خداؤں کے آگے ماتھا ٹیکتا تھا اور وہ بھی جو کسی خدا کو نہ مانتا تھا۔

ایک طرف مذہب ایسا غیر منظم تھا، دوسری طرف پورا سماج ورن آشرم کے چنگل میں پھنس ہوا تھا کہ اسے ایک خداداد نظریہ سمجھا جا رہا تھا اس کی توجیہہ یوں بیان کی جا رہی تھی کہ دنیا کی بہبودی کے لئے وشنو بھگوان نے اپنے سر سے برہمنوں کو، بازوؤں سے کشتریوں کو، پیٹ سے ویش کو اور پیروں سے شودروں کو پیدا کیا۔ سماج کی سہولت وحفاظت کے لئے ہر ایک کے علاحدہ علاحدہ فرائض مقرر کئے، مثلاً برہموں کے لئے وید کی تعلیم اور دان لینا ضروری قرار دیا۔ کشتریوں کو حکم ملا کہ خلقت کی حفاظت کریں، خواہشات نفسانی میں نہ پڑیں۔ ویش مویشیوں کی سیوا کریں، زراعت و تجارت کریں اور دان دیں۔ شودران تینوں ذاتوں کی خدمت میں اپنی سعادت سمجھیں۔ (منوشاستر باب اول ص ۳۱، ۸۷، ۸۸، ۹۱، ۹۹)

قدیم ہندوستان میں مذہب کے بعد سب سے زیادہ اہمیت معاشرت کو دی جاتی تھی۔ اس میں لوگ منوسمرتی کے اصول برتتے تھے۔ پوری انسانی زندگی کو چار خانوں میں مثلاً برہم چاریہ آشرم، گرہست آشرم، وان پرہست آشرم اور سنیاس آشرم میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر و عمل کے دائرے کو بھی تین حصوں میں مثلاً دھرم شاستر، ارتھ شاستر اور کام شاستر میں تقسیم کر دیا گیا تھا انسانوں اور انسانوں میں غیر معقول تفریق کے علاوہ معاشی لوٹ بھی مہاجنی سود کی صورت میں بڑھتی جا رہی تھی۔

جہاں تک خاندانی اکائی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے ایک طرح کی شیرازہ بندی نظر آتی ہے۔ ورن آشرم نظام نے پوری سماجی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جس کی نحوست سے لوگوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے تھے۔ ایک مضبوط سوسائٹی کے وجود میں آنے کے آثار دور دور تک دکھائی نہ دیتے تھے حتیٰ کہ مشترک خطرے کے موقع پر بھی لوگ متحد ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیت ہے کہ یہاں کا سیاسی نظام کبھی یکساں نہیں رہا مشہور مورخ سی۔ وی۔ ویدیا نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عموماً ایک وقت میں کئی کئی حکومتیں برسر اقتدار رہیں۔ زبان، آب وہوا، روایات اور صوبائی خصوصیات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ الگ الگ سلطنتیں قائم ہوں۔ (ہسٹری آف میڈیویل انڈیا ص ۲۲۶)

فنون لطیفہ کو مذہبی تقدس کی وجہ سے اہمیت حاصل تھی۔ فلسفہ بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا اس فلسفے کی اصلیت صرف اتنی تھی کہ عقیدے میں پختگی پیدا کرنے والا ہر کام ''دھرم'' تھا، چاہے فکری عنصر ہو یا نہ ہو۔ البتہ عام زندگی پر اس کا بے انتہا اثر محسوس ہوتا تھا۔ مسئلہ تناسخ اس کی واضح مثال تھی۔ پنرجنم ہندوؤں کی ایک مخصوص اور امتیازی علامت ہے جیسی مسلمانوں میں توحید، عیسائیوں میں تثلیث اور یہودیوں میں سبت عقیدہ یہ تھا کہ روح لازوال ہے۔ جہاں تک اس دور کے زبان وادب کا سوال ہے سنسکرت دیوبانی اور آکاش بانی سمجھی جاتی تھی اور قدرتی طور پر سارے اُپنشد، پُران سمرتیاں وغیرہ اسی زبان میں تھیں، لیکن اس کا دائرہ صرف خواص تک محدود تھا۔ عوام میں دوسری پراکرتیں مروج تھیں۔

دیومالائی ادب کے فرضی قصوں نے عوام کے عقیدوں میں ایک طرح کا جھول پیدا کر دیا تھا۔ پروفیسر کوسمبی نے ان خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگ فطری اور خود ساختہ ضرورتوں میں فرق کرنے کے اہل نہیں رہ گئے تھے قدرت کے پوشیدہ رازوں کی طرف توجہ کرنے کے بجائے اپنی قسمت کی باگ قُدرت کے ہاتھوں میں دیئے بیٹھے تھے۔ اس کیفیت کو موصوف نے ''ہمارے مقدس ادب میں برہمنوں کی جعل سازی'' کا عنوان دیا ہے۔ (An introduction to the study of Indian History p 235)

غرض سماج میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ردعمل بدھ مت کے فروغ کی صورت میں ہوا۔ بدھ مت کے تعلیمات کی وجہ سے سب فرقوں میں ایک ہونے کا تصور عام ہونے لگا۔ سماج کا جو طبقہ برہمنوں سے جتنی دوری اختیار کر گیا تھا اتنا ہی وہ بدھ کے قریب آ گیا۔ لیکن برہمنوں کی سازش وجہ سے بدھ مت کو دیس نکالا مل کر ہی رہا۔ برہمنوں کا گیا ہوا اقتدار لوٹ آیا اور دوبارہ لوگوں میں وہم پرستی اور خوف کا احساس عام ہونے لگا۔ سفارش حسین کے الفاظ میں ''یہی دھرم بھارت میں ترکوں کے آنے کے بعد ہندو دھرم کہلایا'' (قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۷۷)

سارے مورخین اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہندوستان، مذہبی تہذیبی اور سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ جب مسلمان نئے افکار ونظریات کے ساتھ یہاں پہنچے تو فکری، تہذیبی اور لسانی انقلاب کی راہ ہموار ہوگئی اور برصغیر عہد قدیم سے عہد جدید میں آ گیا۔ ہندوستان کبھی پناہ گزینوں، کبھی حملہ آوروں اور کبھی تاجروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ مہرشی ٹیگور کے الفاظ میں یہ ایک میزبان ہے جس کا فرض مختلف مہمانوں کے لئے ٹھکانے اور سہولتیں بہم پہنچانا تھا۔ مسلمانوں کی آمد ایک مہمان کی حیثیت سے تھی لیکن ان کی آمد نے تاریخ ہند میں اک اہم موڑ کا باعث بنی ان کے وجود سے ملک ایک خوش آئند تہذیبی انقلاب سے دوچار ہوا۔

''تحفۃ المجاہدین'' میں مسلمانوں سے اس حسن سلوک کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کے باعث شہر آباد ہوئے، ان کی رونق بڑھی، جہاز رانی کو فروغ ہوا اور ملکی تجارت میں اضافہ ہوا۔ شمال سے ملک کافور کے کوچ کرنے سے بہت پہلے جنوب میں مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے مخصوص انداز اور ذوق کے مطابق اس ملک کی سیاست، تہذیب ومعاشرت، زبان وادب کی ترقی وبہبودی میں حصہ لیا لیکن ایک خاص بات یہ تھی کہ قریب قریب ہر دور میں سیاسی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر احکام جاری کئے جاتے۔ حکومت کے کاموں میں مذہبی عالموں کو کم سے کم دخل دینے دیا جاتا تھا بلکہ ان کی اکثریت نے پنڈت نہرو کے خیال میں مقامی روایتوں کو قائم رکھنے اور مذہب کو سیاسی معاملوں سے الگ رکھنے کا واضح حکم جاری کر رکھا تھا۔ (Discovery of India. p245)

اسلام کا تعارف کراتے ہوئے رام دھاری دنکر نے لکھا ہے کہ بھارت ورش میں اسلام کا پرچار تلوار سے کم، جزیے کے ڈر سے بہت کم، لیکن صوفی سنتوں کے اثر کی وجہ بہت زیادہ ہوا۔ (سنسکرتی کے چار ادھیائے ص ۳۱۳)

پروفیسر آرنلڈ نے تو کھلے لفظوں میں لکھا ہے وہ فرضی مبلغ جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا تاریخ میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اسلام سیاسی قوت بن کر آنے سے پہلے جنوب میں مذہب وتہذیب کے روپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی ہر دور میں صوفیا برابر آتے رہے اور اپنے مشن کو ملک کے گوشے گوشے میں چلاتے رہے۔ ان نیک سیرت لوگوں کے متعلق یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ان کا یہاں تشریف لانا معاشرے کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ انھوں نے چھوت چھات کے اس کریہہ ماحول میں عقیدۂ توحید اور وحدت آدم کے نظریئے کو عملی طور پر پیش کر کے بتایا کہ انکو اپنا لینے کے بعد نہ صرف انسان کی عظمت میں چار چاند لگ جاتے ہیں بلکہ انسان اور انسان کی تفریق بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ انھیں اپنے ان شاندار اصولوں کی اشاعت زبان وقلم سے کرنے کی ضرورت بہت کم پڑی، حال یہ تھا کہ ان کے اخلاق وسیرت کے اعلیٰ نمونے عوام پر خود بخود اثر انداز ہوتے جاتے تھے۔

ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ ملاحظہ ہوں ''اسلام ایک اوتار تھا جو ان کے لئے آکاش سے اترا تھا۔ اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے جنھوں نے توحید اور مساوات کا مژدہ ایک ایسی قوم کو سنایا جس کو سب ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔ اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اخوت کا بلند تر تخیل پیدا کر دیا تھا۔'' (آب کوثر ص ۳۲۹)

یہ مسلم ہے کہ اسلامی تعلیمات کی وجہ سے جہاں ہندوستانی سماج اور تہذیب متاثر ہوئے وہاں ہندو مذہب کی تجدید کا خیال بھی پیدا ہوا۔ تاراچند نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اس حقیقت کا تذکرہ کیا۔ ایک مثال دیکھئے لکھا ہے ''اسلام کے اثر سے ہندو قوم میں مبلغوں کے ایک گروہ نے اس کام کو اپنا فرض اولین سمجھا جو مسلم صوفی کر رہے تھے۔ مہاراشٹر، پنجاب، ہندوستان اور بنگال میں مصلحین نے چودھویں صدی سے عمداً ہندوستان کے قدیمی مذہب کی کچھ باتوں پر عمل کرنے پر زور دیا اور اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے عقائد میں یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی'' (اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر ص ۱۲۷)

اس کے علاوہ اڈیار (شیوا لے) اور الوار (وشنو والے) دونوں کا مقصد ہندومت کی از سر نو تعمیر تھا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور شنکر آچاریہ گزرے ہیں۔ ان کی عقیدۂ توحید اور اصول مساوات کی پسندیدگی اور پختگی کا اندازہ خود انھیں کے الفاظ میں لگانا چاہئے۔ انھوں نے کہا تھا ''کہ جو ایشور کو مانتا ہے وہی میرا گرو ہے، چاہے وہ چنڈال ہو یا دوج۔''

دیگر مصلحین میں رامانج، نمبارکا، مکندیو، بسوا، رامانند، کبیر داس، گرونانک، چیتنیہ پربھو (بنگال) نام دیو اور تکارام (مہاراشٹر) میرابائی (راجستھان) وغیرہ مشہور ہوئے ان تمام کی تعلیمات پر اسلام کا پرتو نظر آتا ہے۔ غالباً اسی لئے بھگتی کی پریم مارگی شاکھا اور تصوف میں اس قدر زیادہ مماثلت نظر آتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تصوف غزل کی شکل میں ویدانت کے علاوہ کچھ نہیں (Sufism is the lyrical version of vedanta) تو کسی نے ان دونوں کو آتما کی اس شانتی کا ذریعہ بتایا جو ادراک سے بالاتر ہے۔ (peace that passethunderstanding) دونوں میں اشتراک مقصد کی وجہ سے فضا میں ایک طرح کی مصالحت پیدا ہو گئی۔

صوفیائے کرام کی لسانی تگ ودو صرف اخلاقی تعلیمات کی اشاعت تک محدود نہیں تھی بلکہ زبان کی تشکیل میں بھی ان کی شعوری کوششیں شامل تھیں۔ مثلاً حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک مرید مہندر دیو نے ایک ڈائری لکھی تھی جس میں یہ عبارت ملتی ہے۔

''آج حضرت نے سنبھل دیو، چیتل دیو اور سیتل دیو کو یاد فرمایا۔ جب ہم سب لوگ جمع ہوئے تو ارشاد ہوا کہ تم سب مل کر ایک ایسی زبان تیار کرو جو ہندوستان میں رہنے والے ہندو اور باہر سے آئے ہوئے مسلمان آپس میں بات چیت کر سکیں اور لین دین کے کام میں لائیں۔ امیر خسرو اور خواجہ سید محمد کی طرف خاص التفات کے ساتھ حضور نے دیکھا اور فرمایا ''میں پہلے بھی تم سے یہ بات کہہ چکا ہوں۔'' ان دونوں نے گذارش کی کہ ہم

مخدوم کے حکم پر عمل کررہے ہیں۔حضرت نے فرمایا ہندی میں ایسے اشعار لکھو جن کو لوگ گا سکیں۔آج کل ہماری 'فارسی' خسرو کی ترکی کے ساتھ ہندوؤں کی بول چال کے بہت سے الفاظ مل گئے ہیں۔اور اب لوگ گھروں میں اور مجلسوں میں ہندی الفاظ بولنے لگے ہیں۔لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو فارسی عربی اور ترکی زبانوں میں ہندی کی آمیزش نہیں چاہتے۔اس لئے ان کو سمجھانا چاہیے کہ ان کا اور ان کی حکومت کا فائدہ اسی میں ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے دل کی بات سمجھا سکیں اور خود ان کی دلوں کی بات سمجھ سکیں اور یہ جب ہی ہوگا کہ ضد کو چھوڑ دیں اور ہندی بول چال کا چرچا بڑھائیں۔" (نورالاولیاء کامل مرتبہ رئیس احمد جعفری)

خسرو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں، یہاں کے ذرے ذرے سے محبت کا اظہار کرتے ہیں آب وہوا، پھولوں پھلوں، باشندوں محلوں، کپڑوں، جانوروں ہی کی نہیں، پان، ریشم وغیرہ کی تک تعریف کرتے تھے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندو مذہب کا دوسرے مذہب سے مقابلہ کرکے اس کی فضیلت ثابت کی۔ہندوستان کی زمین کو جنت قرار دیا ہے۔وہ ہندی کو اپنی مادری زبان پر ترجیح دیتے تھے کہ میں طوطئ ہند ہوں، مجھ سے ہندی میں سوال کرو تو پھر میں بڑی میٹھی گفتگو کروں گا۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ مذہب کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ جو اسے سیکھتا اور بولتا ہے وہ اسی کی زبان ہے۔ چنانچہ مسلمان جہاں بھی گئے وہاں کی زبان کو اپناتے اور اس میں مہارت حاصل کرتے۔ ملیالم، تامل، بنگالی، کشمیری، گجراتی کی واضح مثالیں موجود ہیں۔لیکن جس زبان کو خاص طور سے اپنایا وہ اردو تھی۔مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ" یہ زبان گویا نیم مسلمان تھی۔یعنی تھی تو سب کی، لیکن اس سے مسلمانوں کو نسبت خصوصی حاصل تھی اور ہے۔" (بحوالہ صدق جدید)

ابتدائی دور میں شمالی ہند میں ایک عرصے تک خواص فارسی کو اپنی علمی زبان سمجھتے رہے۔اردو عوام اور صوفیوں میں رائج تھی۔ شمال سے جنوب آنے والوں نے اپنی زبان کو گجری و اردکنی کے ناموں سے موسوم کیا۔جب تاجروں اور فوجیوں کی کھیپ دکن چلی آئی تو اس کا چرچا عمومیت اختیار کرگیا۔بادشاہوں نے دکنی ادب کی سرپرستی کی۔ جب گجرات پر شمال کی یورشیں شروع ہوئیں تو وہاں کے اکثر شعراء اور اہل کمال بیجاپور اور گولکنڈہ چلے آئے کچھ اورنگ آباد، برہان پور اور کچھ کرنول، سدھوٹ، کڑپہ وغیرہ میں جا بسے۔جیسے دہلی کی تاریخ کے بعد لوگوں نے فیض آباد، رام پور، بھوپال اور حیدرآباد جا رہنے میں عافیت دیکھی۔اس طرح یہ زبان اپنے معیاروں سمیت ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیل گئی۔یہ جہاں پہنچی وہاں والوں سے رشتہ جوڑ لیا۔جتنی منتفع ہوئی اس سے زیادہ فائدہ پہنچایا۔اس کا لہجہ الگ الگ جگہوں میں علاقائی زبانوں سے متاثر ہوتا گیا۔دکنی اردو، پنجابی اور سرحدی اردو کا فرق یوں ہی نہیں تھا۔

ہر مذہب وملت، ہر عقیدے اور نظریے کے لوگ اردو کے دلدادہ تھے۔اس کے ادب میں ہندوؤں سکھوں اور عیسائیوں کے حصے کو دیکھ کر یہ نکتہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ یہ اتنی ہر دل عزیز کیوں ہے۔یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ یہ زبان پراکراتی اور سنسکرتی دونوں سے نباہ کرتی ہوئی چل رہی ہے، بالفاظ دیگر ادبی خدمت کے علاوہ بول چال کے کام آرہی ہے مگر اس کی دو حیثیتیں اور ہیں۔ایک علاقائی اور دوسری ہندوستان گیر۔ مقامی حد بندیوں سے باہر اور بے نیاز ہوکر اس نے تاریخ میں پہلی بار ملک کے لسانی اتحاد کا کارنامہ انجام دیا۔ یہ امتیاز کسی اور جدید زبان کو نہیں ملا۔اس طرح یہ نہ صرف اپنی خوبیوں اور خصوصیتوں بلکہ اپنی شاندار خدمات کی بنا پر مقبول ومحترم ہے۔

قومی یکجہتی کے لئے کچھ ذرائع درکار ہیں، اس کے لئے اردو زبان وادب کی خدمات عظیم، وقیع اور پائیدار ثابت ہوسکتے ہیں۔اردو ادب میں شاعری، جذباتی ہم آہنگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔جذبات سے انسان متاثر ہوتا ہے اور شاعری ان جذبات کو متحرک کرتی ہے۔انسان دوستی اور حب الوطنی کے جذبات بلند اور شریفانہ احساسات کو ابھارتی ہے۔اسی طرح انسان دوستی اور حب الوطنی کے جذبات کے لئے شاعری مناسب فضا ہموار کرتی ہے۔ چنانچہ اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ہمیشہ انسان دوستی، محبت، ایثار، حب الوطنی کے جذبات کو ابھارا ہے۔صوفی شعراء کا عہد دیکھئے انہوں نے انسانی وحدت اور باہمی محبت پر زور دیا۔ دنیاوی اغراض کے مقابلے میں بے نفسی اور ایثار کی تعلیم کو اپنا

مسلک بنایا۔ رنگ نسل اور مذہبی اختلافات سے ماورا انسانی وحدت کی تعلیم ملتی ہے جو قومی یک جہتی کے بلند مقصد کو پورا کرتی ہے۔

بستے ہیں تیرے سائے میں سب شیخ و برہمن آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

اردو کی خوش قسمتی ہی کہنا چاہئے کہ ابتدائی دور ہی میں اس کے شعر و ادب میں تصوف اور بھکتی کے میلانات کی وجہ سے انسانی عظمت کا وقیع نظریہ جگہ پایا۔ اس اہم روایت کا آغاز شمال میں خسرو اور جنوب میں گیسو دراز سے ہوا۔ پھر میراں جی، جانم، خوب محمد چشتی، گام دھنی، ولی سراج، محمود بحری، حاتم، میر درد، نظیر، آتش، اقبال وغیرہ نے اسے خوب پروان چڑھایا۔ مگر صوفیوں کے قول و عمل کا خلاصہ بس یہ تھا کہ بندوں کو خدا کے آگے جھکائیں۔ من و تو کا فرق مٹ جائے۔ ظاہری مذہب کے پیچھے جو حقیقت ہے اس کا جلوہ دیکھیں۔

شاہ برہان الدین جانم نے ہندوستانی زبان سے جو مروت برتی وہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

ہندی بولوں کیا بکھان ہے گر پر ساتھا مج گیان

خسرو کا کلام اردو شاعری کا پہلا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے دوہوں، غزلوں، گیتوں اور کہہ مکرنیوں کی کیفیت سے ہر شخص واقف ہے۔ غزل جس کا ایک مصرع فارسی کا اور ایک اردو کا ہے اور وہ جس میں اظہار محبت کا ہندی نہج ملتا ہے۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

خواجہ بندہ نواز کی نظم کا ایک بند ہے:

کھڑے کھڑے پیو جو آپس میں آپ دکھاوے ایسے بیٹھے معشوق کو کوئی کیوں دیکھ پاوے
جنھیں دیکھے سے کوئی سے کوئی نہ بھاوے

ارشاد نامہ

خوشی کہ مج کہو میراں جی عشق بڑھ لیا بودھ پیر کہ میں آکھوں بیان اس میں دھرنا سودھ

محمد قلی قطب شاہ ایک نمائندہ بادشاہ ہے۔ لباس، پگڑی، ہاتھوں کے کڑے اس کے علاوہ اس نے یہاں کے ہر نمایاں اور مقبول رسم کو اختیار کیا۔ عید، بقر عید، نوروز، سنکرانت، ہولی، بسنت وغیرہ تہوار منائے اور ان پر اپنے جذبات کی چھاپ لگا کر ادب کا جزو بنا دیا۔ اپنا پسندیدہ شہر بسایا تو 'بھاگ نگر' نام رکھا جو رانی بھاگ متی کے حیدر محل بن جانے کے بعد حیدر آباد کہلایا۔ اس سلسلے میں خدا سے جس خلوص سے دعا کی ہے اس کا نمونہ دیکھئے۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر رکھا جوں تو دریا میں من (مچھلی) یا سمیع

اس کا کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس کے موضوعات کا لگ بھگ تین چوتھائی حصہ دکنی کلچر سے متعلق ہے۔

وجہی اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا اس نے دکن کو دنیا کی انگوٹھی میں نگینہ اور ملک کے سر کا تاج قرار دیا۔

دکن ملک بھوتیج خاصا اہے تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے۔

ابراہیم عادل شاہ کو دکنی کے علاوہ سنسکرت، برج، اور سب سے بڑھ کر ہندو دیومالا پر عبور حاصل تھا۔ اس کی نورس ان نو جذبات کا مجموعہ ہے جو ہندو فلسفوں کی رو سے انسان میں پائے جاتے ہیں۔

اردو کی پہلی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے قصے کا موضوع ٹھیٹھ ہندوستانی ہے۔ اس زمانے کی فضا ہی کچھ ایسی بنی تھی کہ لوگ ایسی چیزوں کو پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مثلاً عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر ملک الشعراء غواصی نے مثنوی مینا ستونتی لکھی۔ شوکا سب تتی کا اردو میں ترجمہ مثنوی طوطی نامہ لکھی۔ نصرتی نے منوہر و مدمالتی کے مشہور قصے کو گلشن عشق کا نام دیا۔ ابن نشاطی کی پھول بن خاصی مشہور ہے۔ غلام علی، مشرقی، ولی ویلوری

نے پدماوت کا ترجمہ کیا۔ مقیمی نے چندر بدن ومہیار لکھی۔ عارف الدین عاجزؔ نے اندر سبھا کے طرز پر مثنوی لعل وگہر لکھی۔ سید احمد ہنرؔ نے پھول بن کے جواب میں نیہ درپن لکھی جس میں راجہ کنور اور رانی کام لتا کا قصہ ہے۔ شکنتلا کے قصے پر مبنی رشک گل (سید محمد تقی) فراموش یاد (غلام احمد) غازۂ عشق (عنایت سنگھ) نامی مثنویاں لکھیں۔

سماج کے مختلف رسم رواج وغیرہ کی وافر مثالیں امین کی مثنوی بہرام وحسن بانو، شوقی کا میزبانی نامہ (شادی کا ساماں) عبدل کی ابراہیم نامہ (سماجی حالات) نصرتی کا علی نامہ (رزم) غواصی کی سیف الملوک وبدیع الجمال (بزم) وغیرہ دیکھی جاسکتی ہیں۔

ریختی سرتاسر مقامیت کی مرہون منت ہے۔ محبوب کیلئے پیا، پیو، سریجن، ساجن، موہن وغیرہ یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہے۔ محبوب کی آنکھوں کی چمک کو کنول کے پتے پر پانی کے قطروں سے تشبیہ دینا، کھلی زلفوں کے درمیان حسین چہرے کی مثال جیسے موجوں میں سورج چمکتا ہو، معشوق کو رقیب کے ساتھ دیکھ کر شکر میں کنکر کا فقرہ بولنا، آنکھوں کو چلبلاتے سنپولے یا مولے کہنا، نرمل مکھ کی لٹوں کو پانی پر جھکے ناگ کی مثال دینا، معشوق کی ستم رانیوں اور عاشق کے دل کی حالت کے لئے چکی اور آٹے کا استعارہ وغیرہ دکنی طرز فکر کے منھ بولتے ثبوت ہیں۔ خسرو کے زمانے کے بعد ایک خاص صنف ابھری جس میں ہندی کے میں برہ ورتن کی کیفیت ملتی ہے۔ اردو والوں نے اسے مثنوی کا طرز دے دوازدہ ماسہ کہہ لیا۔ افضل کی بکٹ کہانی میں ایک ہجر زدہ عورت کی کہانی ہے۔ بارہ ماسہ میں کئی ایک شاعروں نے جو کلام پیش کیا ہے اس کی ایک مثال دیکھئے

اساڑھ :لگا اندر کا تو بجنے نقارہ قرار وہوش برہن کا سدھارا

کاتک :جو پہنچا ہے دسہرا جگ میں آئے چلیں سکھیاں سبھی تیرتھ نہائے

لگا کاتک پون رت سردی آئی بنا دیں لوگ سب تو شک رضائی

شاہ تراب نے من سمجھاون میں ہندو دشاوتار کا رنگ اختیار کیا۔ جیسے

دکھ ہیرت دکھ بیت سگرو رین کٹت ہے گن گن تارے

آیت اللہ جوہری نے راجا رام اور کنول دیوی کا قصہ لکھا اس کے اسلوب کو بارہ ماسے سے ملتا جلتا رکھا۔ مثلاً

گھٹا ساون کی کاری جب کرے دھوم مرے جی بیچ برہا کرے دھوم

اکارت جائے میری جوانی پیا پردیس یہ کیا زندگانی

محسن کاکوروی کا لامیہ قصیدہ ایک معرکتہ الآرا قصیدہ چیز ہے۔ نعت رسول کو مقامی ماحول میں بالکلیہ رنگ دینے کے باوجود شاعر نے موضوع کے تقدس کو باقی رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل برق کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

جوگیا بھیس لئے چرخ لگائے ہے بھبھوت یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل

خوب چھایا ہے سرگوکل ومتھرا بادل رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

انشا کی رانی کیتکی کی کہانی میں ان کی شاعری کا عمومی رنگ بھی ہندوستانی ہے

بنی ہوئی کہیں رادھا کہیں کنہیا جی پتمبر اوڑھے ہوئے، سر پر رکھے مورمکٹ

سانولے پن پر غضب ہے دھج بسنتی شال کی جی میں ہے کہہ بیٹھئے اب جے کنھیا لال کی

اس دور کی کہانیوں میں قدیم ہندوستانی لوک کتھائیں، دیومالائی قصوں کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں سیدھا سادہ تھا یعنی دل میں آرزو ہوتی تھی کہ وطن پر کسی طرح کی آنچ نہ آئے، سبھی خوش وخرم رہیں۔

غالبؔ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اس کا مشرب 'صلح کل' تھا غالبؔ کی آرزو ہر شخص کے دل کی تمنا بن جاتی ہے ''قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو داعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے..... نہ وہ دستگاہ عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم کا نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ غالب کی شخصیت کا یہ پہلو صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ حد بندیوں کو توڑ کر انسانوں کو ایک لڑی میں پرو سکے۔

غالبؔ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں بت خانہ سے ہجرت کر کے اگر کعبہ میں جا بسوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بے وفا ہوں اور دیر والوں سے جو تعلقات تھے ان کو بھول گیا ہوں۔

کعبہ میں جا رہا ہوں تو نہ دو طعنہ کی کہیں بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو
وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

آتشؔ کی رواداری کا حال یہ ہے کہ

بت خانہ توڑ ڈالئے، مسجد کو ڈھایئے دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مکان ہے

کلام کو حسن بخشنے میں تشبیہات و استعارات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مضامین میں وسعت اور ہمہ گیری تلمیحات کی وجہ سے آتی ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال ادائی خیال کا ایک مؤثر ذریعہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مقامی ادب کی کوئی ایسی تشبیہ نہیں ہے جو اردو شاعری میں استعمال نہ ہوئی ہو۔ یہی حال محاورات، استعارات وغیرہ کا ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں بیشتر اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں نمونتہً ایک ایک مثال دیکھئے۔

تشبیہ : میں تو صف محشر میں بھی لوں گا تجھے پہچان را نجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشہ (نظیرؔ)

تلمیح: آتش عشق نے راون کو جلا کے مارا گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں (میرؔ)

محاورہ و ضرب المثل: غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

کہے نہ بھولا اس کو ظفرؔ جو، صبح کا بھولا سانج کو آئے چھوڑ کے رگڑے جھگڑے اپنا رب سے دھیان لگاؤ جی

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اس بنا پر یہاں مختلف رسموں اور تہواروں کا رواج پایا جاتا ہے۔ اردو ادب میں ان سب پر کثرت سے طبع آزمائی ہوئی۔ مثلاً بسنت یہ ہندوستان میں بہار کی آمد کا زمانہ ہوتا ہے۔ اہل ہنود جذبات خوشی کا مظاہرہ کرنے کے لئے جشن بہاراں مناتے تھے مسلمان بھی اس میں شریک ہو جاتے۔ ؎ بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا تمے ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا (محمد قلی)

مغل دربار کا جشن بہت مشہور ہے۔ شاہ عالم نے نادرات شاہی میں لکھا ہے۔ ؎

آج لے لے آئیں سب سکھی مل یہ نیکو رنگ نئے نئے پھولن سوں کھیلیں بسنت شاہ عالم کے سنگ

ہولی اور دیوالی : بادشاہوں کے دربار اس تہوار سے رنگین ہو جاتے۔ بادشاہ اس موقع پر ایکیس چھید والے برتن میں نہاتے۔ خود کو سیم و زر میں تولتے اور اس کو غریبوں میں تقسیم کیا کرتے۔ ؎ ہے دسہرے میں گو فرحت نظیرؔ پر دوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

ہولی کی بہار آئی فرحت کی کلی کھلیاں باجوں کی صداؤں سے کوچے بھرے اور گلیاں
دل برسے کہا ہم نے نک چھوڑ یہ چھل بلیاں اب رنگ گلالوں کی کچھ کیجئے رنگ رلیاں
ہولی میں یہی دُھو میں لگتی ہیں بہت بھلیاں

میلے ٹھیلے: بعض میلے مذہبی ہوتے ہیں اور بعض تاریخی و تہذیبی کچھ طبقاتی اور کچھ علاقائی، لیکن مجموعی طور انھیں ہندوستانی معاشرت میں ایک اہم مقام حاصل ہے، حتیٰ کہ بزرگوں کے مزاروں پر عرس وغیرہ کے دوران میں میلوں کا رواج پڑ گیا تھا۔ کلیات نظیر میں ایسی بے شمار نظمیں موجود ہیں، خصوصاً آگرے کے میلوں میں کھیل تماشوں، جلوسوں، رسموں، ریتوں کی تفصیل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے بلدیو جی کے میلے کے علاوہ سلیم چشتی

کے عرس کی جزئیات، تیراکی، پتنگ بازی، کبوتر بازی، اور دیگر بازیوں کے احوال شاعر کے گہرے مشاہدے پر منحصر ہیں۔

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں باراہ ہے کہیں مدن موہن کہیں بلدیو اور کہیں سی کشن
اپسراؤں میں ہیں اس کے جتن کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن
کہیں نکلا ہے سیر کو بن بن کہیں کہتا پھرے ہے توں بن بن
رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے روز بلدیو جی کا میلا ہے

یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آج تک کسی ملک کے مسلمانوں نے دو مختلف تمدنوں میں اتنی ہم آہنگی پیدا نہیں کی جتنی کہ ہندوستانی مسلمانوں نے کی۔ ایک طرف اپنی مذہبی، سیاسی اور تہذیبی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوئے، دوسری طرف اپنی قومیت اور وطنیت کے دائرے کو محدود ہونے نہیں دیا، تیسری طرف اس ملک کو اپنا وطن خاص سمجھ کر اس کی مادی اور اخلاقی تمدنی اور دینی ہر طرح کی ترقیوں میں دل و جان سے حصہ لیا۔ اس بارے میں ایک وائسرائے کے الفاظ ملاحظہ ہوں ''بہت سے اعتبارات سے مسلمان ہم پر سبقت لے گئے۔ فتح کے بعد وہ ان ممالک میں بس گئے، وہاں کے باشندوں سے گھل مل گئے، شادی بیاہ کیا، انھیں سیاسی حقوق دئے، مذہبی آزادی دی۔ فاتح اور مفتوح کی ہمدردیاں ایک ہوگئیں۔'' (ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت (میجر باسو) ص ۴۴۶)

مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں کی آمد و رفت سے تاریخی مواد اکٹھا ہونا شروع ہوا۔ ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ خود سنسکرت کے علمی خزانوں سے استفادہ کی گنجائش نکلی، یہاں کی روایات، فلسفہ تہذیب و تمدن سے دنیا کے اور لوگ واقف ہوئے۔ ہندوستانی طب، نجوم، فلسفہ، ہیئت اور موسیقی کی کتابوں کا عربی ترجمہ، فارسی میں ترجموں کا جہاں تک تعلق ہے سنسکرت کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جسے لوگوں نے منتقل نہ کیا ہو۔ دراصل مسلمان علمی و ثقافتی میدانوں میں ہر دور میں نہایت مستعد رہے۔ ابوریحان البیرونی نے عربی و ایرانی علوم کو اور اہل ہند کی تخلیقات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ اسی طرح ابن بطوطہ اور المسعودی نے بھی اسلام کو ہندوستانی ادبیات سے روشناس کرایا۔

آزادی سے قبل بھی ملک میں تفرقہ تھا اس وقت خیال یہی تھا کہ اس کی بنیاد انگریز ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا صحیح ہے کہ اس دور میں بوئے ہوئے بیج آج پھل دے رہے ہیں۔ مگر ہندوستانیوں میں موجود فرقہ پروری اور تنگ نظری سے ہم کیسے منہ موڑ سکتے ہیں؟ مانا کہ اکثریت فرقہ پرستی کے خلاف ہے، لیکن چند شر پسندوں کو یہ روک نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ کہ بدنامی سب کا مقدر بن گئی ہے۔

بہر حال ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے سلسلے میں اب تک جو کوششیں ہوئیں وہ ناقابل اطمینان ہیں۔ بعض کوششیں اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے کی گئیں لیکن وہ تجویزوں، منصوبوں اور نعروں سے آگے نہ بڑھ سکیں خیر سے ان نعروں کی بدولت حوصلہ تو ضرور ملتا ہے، لیکن انہیں عملی جامہ پہنانے کی ایماندارنہ کوشش نہیں ہوئی۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اتحاد و اتفاق ایک ایسی نعمت ہے جو ہر اعتبار سے مفید ہے اس کے بغیر قوم کا بحیثیت مجموعی اپنی مادی اور اخلاقی بہبودی کی منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔

ہمارا ملک ایک جغرافیائی اکائی تو ہے مگر سماجی نقطۂ نظر سے یہ ایک ایسا براعظم ہے جس کی ساری مذہبی و تہذیبی اکائیوں کے حقوق مقررہ اور مسلمہ ہیں۔ جزوی اختلافات اور تضادات کے باوجود ان تمام کا ہماری مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں برابر کا حصہ رہا۔

میں اس مقالے کو جان نثار اختر کے ان اشعار پر ختم کرنا چاہوں گا۔

یہ دیش کہ ہندو اور مسلم تہذیبوں کا شیرازہ ہے صدیوں کی پرانی بات ہے یہ، پر آج بھی کتنی تازہ ہے
تہذیب کی اس یکجہتی کو اردو کی شہادت کافی ہے کچھ اور نشاں بھی ملتے ہیں تھوڑی سی بصیرت کافی

☆

کتابیات

ہندستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں

اردو کی ہندیت نوائے ادب بمبئی ۱۹۵۴

رسوم دہلی: سید احمد

مقالات : شعبۂ اردو مانسا گنگوتری میسور۔۲

قومی یکجہتی ایک مطالعہ: ڈاکٹر عبدالاحد

حرف اقبال

کلیات محمد قطب شاہ: سیدہ جعفر

تشکیل جدید الٰہیات

ینگ انڈیا شمارہ ۱۲ مئی ۱۹۲۰

تاریخ تمدن ہند

این انٹرڈکشن ٹو دی سٹڈی آف انڈین ہسٹری

قومی تہذیب کا مسئلہ

ہندوستان میں عیسائیوں کی حکومت

اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر

قومی یکجہتی کا پہلا علمبردار : امیر خسرو بڑے نابغہ روزگار تھے لیکن انہیں ایران و توران سے زیادہ ہندوستان سے محبت تھی انہوں نہ نظم و نثر فارسی میں اتنا لکھا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کے بس کی بات نہیں۔ ان کی ہندوستان دوستی اور ہندوستان کے باب میں ان کے عمیق مطالعے کا حال ان کی زبانی مثنوی نہ سپہر میں ملتا ہے۔ اس میں ہندوستان سے متعلق بڑی دلچسپ معلومات درج ہیں یہاں کی آب و ہوا، پھول چرند پرند، مذاہب اور زبانوں کے بارے میں تفصیلی معلومات ہیں اور شاعر نے ہندوستان کی خراسان اور دیگر ممالک پر برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ہندوستان سے اتنی عقیدت کیوں اور اس کی تعریف کیوں؟ تو خود ہی جواب دیا ہے ۔ ہست مرا مولد ماوا و وطن

خسرو نے ہندوستان کو بہشت عدن کہا ہے۔ اور اس کے لئے دس حجتیں پیش کی ہیں اور متعدد شعبوں میں ہندوستان کی فوقیت کو ثابت کیا ہے اور